ڈاکٹرمحمد کیومرثی

صدر شعبہ اردو،تہران یونیورسٹی ، ایران

اردو افسانوی ادب کی تشکیل میں فورٹ ولیم کالج کا حصہ

Dr. Muhammad Keumarsi

Head,Department of Urdu, University of Tehran, Iran

Urdu Fiction and the Role of Fort William College

History of literature does not always experience a certain regular direction toward growth within a special process or trend. It takes decades for meanings and contents of some books written now, to be understood. Such formation and changes of concepts especially in the methods of writing novels and stories which are significant in disclosing the history of fiction writing of the country's literature include different generations of writers. Regarding the primary experiences of fiction literature of Urdu and also among basic influential factors in this regard, we can refer to Fort William College. Establishment of this college plays a significant role in expansion and growth of Urdu literature. After establishment of this college many attached writers and translators seriously applied hidden facilities and capacities of Urdu language to mark a new chapter of Urdu prose.

اردو کی نثری داستانوں کا باقاعدہ آغاز فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ہوتا ہے۔ یہ کالج ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں ظہور پذیر اور قائم ہوا۔ اس کالج میں درس وتدریس کے شعبے کے علاوہ ایک اور تصنیفی اور تالیفی شعبہ بھی قائم ہوا تھا جس میں زیادہ تر قدیم کتب کے ترجمے اور تالیف کا کام کیا جاتا تھا۔ دراصل فورٹ ولیم کالج نے اردو کے افسانوی اور نثری ادب میں ایک بڑا اہم کردار ادا کیا اور اس نے خصوصاً اردو نثر میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ایک مسئلہ یہ کہ اس کالج کے قیام سے اردو

نثر نے مرصع کاری اور تزئین گری سے نجات پائی اور سبک اندام ہوئی۔ اس کالج میں زیادہ تر زور داستانوں پر تھا اور اس کے مصنفین کی اکثر کاوشیں داستانوں اور قصوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس کالج کے قیام سے اردو افسانے کی جہتیں ایک عظیم شاہراہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کالج میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ پہلے پرنسپل کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور وہ خود اردو جانتے تھے اور اردو زبان کے پروفیسروں میں شمار ہوتے تھے۔ اس کالج کی تصنیفات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

الف۔ تصنیفات فورٹ ولیم کالج

ب۔ تصنیفات بیرون فورٹ ولیم کالج

تصنیفات فورٹ ولیم کالج

طوطا کہانی: طوطا کہانی سید حیدر بخش حیدری کی تصنیف ہے۔ کالج کے مصنفین میں سے اس مصنف کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کالج میں زیادہ علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں اور دس کتابیں انہوں نے تصنیف کی ہیں۔ ان میں سے ایک طوطا کہانی ہے اور دوسری کتاب ''قصہ مہر و ماہ'' ہے جسے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے افتتاح پر انہوں نے یہ قصہ لکھا اور ڈاکٹر گل کرسٹ کو پیش کیا اور اُنہوں نے اس کتاب کو بہت پسند کیا اور حیدر بخش حیدری کو کالج کے ملازموں میں شامل کر لیا۔ حیدری نے طوطا کہانی کی کتاب کو بھی گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء/ ۱۲۱۵ھ میں سید محمد قادری کے طوطی نامے کا ترجمہ کر کے اس کا نام طوطا کہانی رکھا۔ دراصل مترجم نے اس کہانی میں روزمرہ و محاورے کا خیال رکھا ہے۔ اسلوب بیان کے اعتبار سے یہ کہانی سنسکرت الاصل معلوم نہیں ہوتی۔ اس کی زبان سنسکرت اور ہندی کی بجائے عربی اور فارسی زدہ ہے۔ اگرچہ کتاب سادہ اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے، لیکن تنقید سے بھی خالی نہیں۔ اس میں جا بجا فارسی محاورات کا لفظی ترجمہ نظر آتا ہے، ایک نمونہ عبارت درج ذیل ہے:

> ''آخر وہ چاروں ہر ایک مہرہ اپنے سر پر رکھ کر ایک طرف کو چلی۔ جب کئی کوس گئے ایک کے سر کا مہرہ گرا۔ اس نے ایک جگہ کو کھودا تو تانبا نکلا۔ اس نے ان تینوں سے کہا کہ میں اس تانبے کو سونے سے بہتر سمجھتا ہوں اگر تمہارا جی چاہے تو میرے ساتھ یہاں رہو.....'' (۱)

داستان امیر حمزہ: اس داستان کا خلیل خان اشک نے ۱۸۰۱ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر پہلی بار فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس داستان میں چار دفتر اور اٹھاسی داستانیں ہیں۔ داستانِ امیر حمزہ کا اصل مقصد اسلام کی تبلیغ و ترویج ہے۔ اس کتاب کی عبارتیں رواں اور سلیس ہیں۔ اس میں ہندوستانی اور ایرانی رسم و رواج کی آمیزش نظر آتی ہے۔ اس داستان کے کچھ کردار سرزمینِ عرب کے باشندے معلوم ہوتے ہیں اور ان میں سے کچھ کردار خالص ایرانی ہیں کہیں سماج اور معاشرہ بالکل ہندوستانی ہے۔ البتہ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اصل قصہ کس کے ذہن کی تخلیق ہے چونکہ اس کتاب میں اہلِ اسلام اور کفار کے درمیان معرکوں کا بیان ہے اس لئے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ تصنیف عہدِ غزنوی ہوگا۔ اس کتاب میں معرکوں کی وجہ سے مذہبی جوش اپنے پورے شباب پر نظر آتا ہے۔

داستانِ امیر حمزہ میں انیسویں صدی کے لکھنؤ کی معاشرت کی عکاسی بھی جا بجا کی گئی ہے اور انتہائی سلیقے سے میلے ٹھیلوں کے نقشے کھینچے گئے ہیں۔ اس داستان کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہ محض ثقۂ داستان نہیں، اس میں ظرافت اور شوخی کے انگ بھی ہیں۔ یہ شوخیاں اور مضحکہ خیزیاں کئی قسم کی ہیں اور زیادہ تر عیاروں کی آوردہ اور پروردہ ہیں۔ اس داستان میں ہیرو بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ عورتوں کے حُسن پر عاشق ہوتے ہیں اور وہ کئی خواتین سے شادیاں کرتے ہیں۔ اس کتاب کا نمونہ ملاحظہ ہو:

''عمرو نے جو یہ احوالِ امیر کا دیکھا بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور کہنے لگا۔ یا صاحب قراں واسطے خدا کے ہم لوگوں کی جان پر رحم کرو، اتنی بے صبری خوب نہیں آج کی رات اوس معشوقہ کے محل کی طرف جانا موقوف کرو کہ غستر تیغ زن طلایہ میں مقرر ہوا ہے ایسا نہ ہو کہ اس امر سے واقف ہو اور تم کو کچھ ایذا پونچاوے.....'' (۲)

شکنتلا: یہ داستان ڈرامے کی صورت میں سنسکرت کے مشہور شاعر کالی داس نے لکھا اور نواز کوی نے اس کو برج بھاشا میں نظم کیا آگے جا کر کاظم علی جوان نے اسی کو اردو نثر میں ایک افسانے کے طور پر ترجمہ کیا۔ جواں نے ۱۸۰۱ء میں اسے ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی عبارتیں سادہ اور عام فہم ہیں البتہ کہیں کہیں قافیہ اور سجع کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ اس میں تنقید بھی ملتی ہے۔ اس کتاب میں مترجم نے جا بجا ابیات، اشعار قطعات اور رباعیات داخل کر دی ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۰۴ء کی اشاعت سے پہلے جوان اور للّو لال نے اس پر نظر ثانی کر دی۔ جواں نے اپنی زبان کو ریختہ کہا ہے انہوں نے ہندی الفاظ بڑی خوبی سے استعمال کیے ہیں۔ اس کتاب کا ایک نمونہ عبارت درج ذیل ہے:

''منی نے سنبھال سنبھال سبھوں کو وہاں رکھا، پھر اپنے چیلوں سے کہا راجا دشمنت (دشینت) کو سمجھا کے ہمارا سندیسا دیجو، ہم تمہارے پوجنے کے لائق ہیں اور تم ہمارے ہو شکنتلا ہماری بیٹی ہے اسے جی سے پیارا جاننا۔ ہمیں تم نے مکان میں نہ آنے دیا، آپ ہی شادی کر لی اب ایسا کیجو جو شکنتلا آرام سے رہے کیونکہ اس کی بے چینی سے ہمیں چین نہ ہوگا.....'' (۳)

آرائش محفل: یہ کتاب سید حیدر بخش حیدری کی دوسری کتاب ہے۔ اس کتاب میں حاتم طائی کے سات سفروں کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔ حیدر بخش حیدری نے آرائش محفل کے دیباچے میں لکھا ہے:

''یہ قصہ عبارت فارسی، زبان سلیس کسی شخص نے آگے لکھا تھا اب اس کو سید حیدر بخش حیدری متخلص بہ حیدری دلی والی نے بموجب حکم گل کرسٹ بہادر دام اقبالہ کے سنہ بارہ سو سولہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے، زبان ریختہ میں موافق اپنی طبع کے اس کتاب سے ترجمہ نثر میں کیا اور نام اس کا آرائش محفل رکھا.....'' (۴)۔

دراصل آرائش محفل ایک اخلاقی داستان شمار ہوتی ہے اور اپنی دلچسپی کے سبب بہت مقبول ہے۔ اس میں حاتم طائی کی مہموں کی داستان ہے۔ حیدری کی اس کتاب کے جملے طویل ہوتے ہیں اور اس میں انہوں نے جا بجا عربی اور فارسی الفاظ

وتراکیب بھی استعمال کی ہیں۔اس قصے کا ہیرو حاتم طائی ہے اور اس کے علاوہ حسن بانو کے کردار بھی نہایت دلچسپ اور رومانی ہیں۔حاتم طائی جو اس قصے کا ہیرو شمار ہوتا ہے دراصل وہ پیکر اخلاق ہے اور سب کو اخلاقی سبق سکھاتا ہے مثلاً ''نیکی کر دریا میں ڈال'' اور ''کسی سے بدی نہ کر'' اور ''سچ کہنے میں ہمیشہ تو راحت ہے''۔

اس طرح کی عبارتیں اس قصے کے مقاصد کو واضح کر کے سب لوگوں کے لیے اخلاقی درس بن جاتے ہیں۔اس قصے میں لوگوں کے عام عقائد و اوہام کے نمونے بھی دستیاب ہیں دلی کی معاشرت کے خاکے بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ حیدری نے میر امن کی طرح اور ان کی تقلید میں کئی جگہ خدمتگاروں کے نام گنوانے کی سعی کی ہے۔اس داستان کی زبان سادہ اور بول چال کا سا انداز ہے۔اس کتاب کی ایک خامی یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ ربط اور تسلسل کی کمی نظر آتی ہے اور اسی وجہ اس میں باغ و بہار والی تاثیر لطافت اور اندازِ دلبری نہیں پائی جاتی۔اس قصے کا ایک نمونہ عبارت درج ذیل ہے:

> ''ہم جولیوں نے کہا بی بی حاتم بھی یمن کا شہزادہ ہے، تمہارے نصب اچھے تھے، جو یہ خود بہ خود یہاں آیا تم جو اس سے اپنی شادی کرو گی ہر طرح سے نام آوری اور بہتری ہے اور اپنے باپ کے مرنے کا غم نہ کرو۔وہ کم بخت جادوگر خوب ہوا جو موا۔تمام جہاں کا فساد مٹا.....''(۵)۔

مادھونل کام کندلا: یہ قصہ سنسکرت کا قصہ ہے اس میں مادھونل برہمن ہے اور کام کندلا طوائف ہے۔اس قصے میں ان دونوں کے عشق کا بیان کیا گیا ہے۔مظہر علی خان ولا نے للولال جی کی مدد سے ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔اس کتاب کی نثر مقفی اور پر تکلف ہے۔سنسکرت کے اس قصے کو مولی رام کبیشر نے برج بھاشا سے اردو میں ڈھالا۔ البتہ ان کے اردو ترجمہ سے پہلے، دکنی زبان میں مثنوی کام کندلا موجود تھی۔اس کتاب کا ایک نمونۂ عبارت درج ذیل ہے:

''بلند بلند مکانوں کے بالا خانوں کا عالم دیکھ کر آسمان زمین کا عالم تہ و بالا، نئے نئے طور کے مکان منقش عالی شانوں پر سنہری کلسوں کے چمکنے سے عجیب اجالا، صاحب علم و ہنر، نیک افعال و نیک کردار اور لوگ اچھے اچھے آرام چین سے اس بستی میں بستے تھے.....''(۶)

باغ و بہار: یہ کتاب میر امن کی تصنیف ہے جس کا اصل ماخذ قصہ چہار درویش ہے۔میر امن کے آبا و اجداد سلاطین مغلیہ کے عہد میں ممتاز جاگیروں سے سرفراز تھے۔میر امن بھی فورٹ ولیم کالج کے ملازمین میں شمار ہوتے تھے۔انہوں نے باغ و بہار ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر لکھی۔آغاز تصنیف ۱۸۰۱ء میں ہے اور ۱۸۰۲ء میں انہوں نے یہ کتاب ختم کر لی۔قصۂ چہار درویش کو پہلی بار میر محمد حسین عطا خان تحسین نے ۱۷۶۸ء اور ۱۷۷۵ء کے دوران اردو جامہ پہنایا اور اس کا نام ''نوطرز مرصع'' رکھا۔میر امن نے اس قصے کو اردو میں منتقل کر کے اس کا نام باغ و بہار رکھا اور دراصل میر امن کا ترجمہ تحسین کے ترجمے سے کہیں سلیس اور مؤثر ہے۔میر امن سبب تألیف کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''یہ قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زربخش جوان کے پیر تھے اور درگاہ ان کی دلی میں قلعہ سے تین کوس لال دروازے کے باہر

ٹیادروازے سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے ان کی طبیعت ماندی ہوئی۔تب مرشد کا دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور تیمار داری میں حاضر رہتے، اللہ نے چند روز میں شفا دی.....''(۷)

یہ کتاب دراصل افسانہ نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ شمار ہوتی ہے اور اسلوب، کردار اور پلاٹ کے حوالے سے ہر لحاظ سے اپنا اعتبار درجہ اول رکھتی ہے۔میر امن قصہ گوئی کے اصول سے بخوبی واقف تھے۔سادگی اس قصے کی جان اور دلچسپی اس کی روح ہوتی ہے۔میر امن زبان و بیان پر بہت قدرت رکھتے تھے۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ اس کے سامنے مودب اور دست بستہ کھڑے ہیں اور بلاشبہ باغ و بہار کی مقبولیت وشہرت کا سبب اس کی زبان و بیان ہے۔اس کتاب میں میر امن کے تمام کردار زندہ کردار ہیں اور وہ زندگی کے مکمل نمونے ہیں۔انہوں نے اس کتاب میں قواعد زبان کی پابندی سے زیادہ تر روزمرہ کا خیال رکھا ہے۔بے تکلفی، سادگیِ عبارت اور اس کے ساتھ ساتھ فصاحت اور لطفِ بیان، فقروں کی شگفتگی اور برجستگی ایسی خوبیاں ہیں جو کمتر لوگوں اور مصنفوں میں پائی جاتی ہیں۔ان کی یہ شاہکار دراصل اردو نثر میں ایک جاوید معجزے کی طرح دکھائی دے گی۔

معاشرت کی مرقع نگاری باغ و بہار کا طرۂ امتیاز ہے(۸)۔اس میں ہندوستانی معاشرت کی بڑی شان سے عکاسی کی گئی ہے خصوصاً عہد مغلیہ کی معاشرتی اور سماجی حالات کی بھرپور مرقع کشی کی گئی ہے۔میر امن کے لہجے میں نرمی اور شیرینی ملتی ہے۔وہ اپنی عبارت میں جا بجا ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔میر امن نے اس داستان میں عوامی کہاوتوں کا بہت سہارا لیا ہے۔اس میں چار درویشوں اور ایک بادشاہ یعنی کل پانچ اشخاص کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔باغ و بہار میں اس زمانے کی معاشرت کا حقیقی اور کامیاب نقشہ نظر آتا ہے۔سلاطین وامرا کے محلات کی معاشرت، انتظام حکومت، عوام کی مہمان نوازی، امرا کی مے نوشی اور رقص وسرور کی محفلیں، تبلیغ مذہب کی کوششیں، جادو، نجوم، ٹوٹکے، شگون اور فال، تعویذ گنڈے، صدقہ وخیرات، شادی بیاہ، تعمیر مکان، سفر کے موقعوں پر جاتے وقت امام ضامن کا باندھنا، صدقہ اتارنا، غیبی قوتوں پر اعتقاد، درویشوں سے مصیبت کے وقت امداد طلبی، آتش بازی، .....غرض سب کچھ بیان کر دیا ہے اور امن کی زبان دراصل کہیں بھی کوتاہی نہیں کرتی۔(۹)اس کتاب کا ایک نمونہ عبارت درج ذیل ہے:

''کل رات سپنے میں دیکھا کہ کوئی مانس کہتا ہے کہ شتابی اٹھ اور گھوڑا جوڑا اور کمند اور کچھ نقد خرچ کے واسطے لے کر اس غار پر جا اور اس بے چارے کو وہاں سے نکال۔یہ سن کر میں چونک پڑی اور مگن ہو کر مردانہ بھیس کیا اور ایک صندوقچہ جواہر واشرفی سے بھر لیا اور یہ گھوڑا اور کپڑا جوڑا لے کر وہاں گئی کہ کمند سے کھینچوں.....''۔(۱۰)

گنج خوبی: یہ کتاب میر امن کی دوسری کتاب ہے یہ کتاب دراصل فارسی کی کتاب اخلاق محسنی کا اردو ترجمہ ہے۔میر امن نے گل کرسٹ کی فرمائش پر یہ کتاب ۱۸۰۲ء میں لکھی۔میر امن کی یہ کتاب اپنے مضامین کے اعتبار سے بہت سنجیدہ ہے۔اس

کتاب کے چالیس باب ہیں۔میرامن نے اس میں روزمرہ اور محاورات کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کتاب کی تاریخ تألیف اور نام کے بارے میں میرامن لکھتے ہیں:

''سن ایک ہزار دوسوسترہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سے دوعیسوی کے باغ و بہار کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا۔ازبس کہ جتنی خوبیاں انسان کو چاہیں اور دنیا کی نیک نامی اور خوش معاشی کے لیے درکار ہیں سوسب اس میں بیان ہوئیں،اس واسطے اس کا نام بھی گنج خوبی رکھا''۔(۱۱)

اس کتاب کا ایک نمونہ عبارت درج ذیل ہے:

''کہتے ہیں کہ حضرت امیرالمؤمنین مرتضی علی کو جب خلافت ظاہری ہوئی یعنی نبی کی مسند پر بیٹھے، ہمیشہ دن کو خلق اللہ کے کاروبار میں مشغول رہتے اور رات کو بندگی خالق بجالاتے۔اصحابوں نے عرض کی اے سردار مومنوں کے!اتنی محنت اپنے اوپر کیوں روا رکھتے ہو۔نہ دن کو آرام فرماتے ہو اور نہ رات کو ذرا چین سے سوجاتے ہو۔آپ نے فرمایا کہ اگر روز کو آسائش کروں تو رعیت خراب وتباہ ہو اور جو شب کو استراحت کروں تو کل روز محشر میں، میں حیران و پریشان رہوں اور خدا کو کیا جواب دوں اس لیے دن کو آدمیوں کا کام کرتا ہوں اور رات کو خدا کے کام میں مشغول رہتا ہوں''۔

نثر بےنظیر: میرحسن کی مشہور اردو مثنوی سحرالبیان کو ۱۸۰۲ء میں فورٹ ولیم کالج میں میر بہادر علی حسینی نے اردو نثر کا جامہ عطا کیا۔ میر بہادر حسینی نے اپنی ایک اور کتاب ''اخلاق ہندی'' میں جو اسلوب نگارش اختیار کیا ہے وہ بہت سلیس اور سادہ زبان میں ہے۔لیکن اس نے نثر بےنظیر میں مسجع اسلوب اختیار کیا ہے۔حسینی دراصل فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندی میں چیف منشی تھے۔اس کتاب میں حسینی نے اپنے جملے مختصر اور چھوٹے چھوٹے لکھے ہیں۔اس میں کہیں کہیں قافیے کا التزام بھی موجود رہا ہے جس سے تنقید پیدا ہوجاتی ہے۔ڈاکٹر گل کرسٹ نے اصل مثنوی کے ساتھ ۱۸۰۳ء میں اسے بھی چھپوایا تھا اور اپنی بیاض ہندی میں بھی اس کا ایک نمونہ شائع کیا تھا۔اس کے دوسرے ایڈیشن پر میر شیر علی افسوس نے نظر ثانی کی۔اس کتاب کے انگریزی میں بھی ترجمے ہوچکے ہیں۔اس کتاب کا ایک نمونہ عبارت درج ذیل ہے:

''یہ صورت دیکھ سب کی سب غش کر گئیں۔وے جیتی جو آئی تھیں سو جیتے ہی جی مر گئیں پھر جوں توں اپنے تئیں سنبھال جلدی جا کر اس احوال کو شہزادی سے عرض کیا کہ اے شہزادی سیر مہتاب میں ایک طرف تماشا ہے ایسا کبھو خواب میں بھی نظر نہیں آیا۔ہمارے کہنے سے تو تم ہرگز نہ مانو گی ہاں جو اپنی آنکھوں سے دیکھو گی تو جانو گی۔خدا کے واسکے ٹک شتاب چلو کہیں وہ بہار ایک آن میں جاتی رہے ایسا نہ ہو.....''۔(۱۲)

اخلاق ہندی: یہ کتاب میر بہادر علی حسینی کی دوسری کتاب ہے اور نثر بےنظیر کی بہ نسبت یہ کتاب بہت مقبول عامہ ہوئی۔دراصل اس کتاب کو مفتی تاج الدین بن معین الدین الملکی نے ہتوپدیش کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور اس کا نام مفرح القلوب رکھا۔

میر حسینی نے ۱۸۰۲ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر اسے اخلاق ہندی کے نام سے اردو جامہ پہنایا۔ یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی اور یہی ایڈیشن اخلاق اہندی کا مکمل ایڈیشن شمار ہوتا ہے۔

اخلاق ہندی کی بہت سی حکایتیں دوسری کتابوں میں بھی مل جاتی ہیں۔ یہ کہانیاں اکثر انسانی سرشت کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ بیشتر کہانیاں چرندوں اور پرندوں کے بارے میں ہیں۔ان میں اخلاقی درس بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اس کتاب میں بہادر حسینی کی زبان سادہ اور سپاٹ ہے۔اخلاق ہندی ادبی سے زیادہ تر درسی تصنیف ہے اور حسینی اپنے مقصد میں کامیاب دکھائی دیتا ہے۔اس کتاب میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال مناسب طریقے سے کیا گیا ہے اور دونوں میں موازنہ پایا جاتا ہے۔حسینی کے جملوں کی طول واختصار میں کوئی برابری نہیں ملتی۔دراصل اس کتاب میں نہ میر امن کی باغ و بہار کا چٹخارہ ہے اور نہ آرائش محفل کے جملوں کی شیرینی وحلاوت۔لیکن اس کی عبارتوں میں روانی موجود ہے۔اس کتاب کا ایک نمونۂ عبارت درج ذیل ہے:

> ''سنا ہے کہ ایک کمینہ بداصل کہیں راہ میں چلا جاتا تھا۔اتفاقاً ایک صوفی سے ملاقات ہوئی۔اس نے پوچھا کہ اے یار! تو کہاں جاتا ہے؟اس نے جواب دیا کہ گجرات اور وہاں سے آجین جاؤں گا۔کہا کہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔مجھے بھی وہاں جانا ہے۔یہ بولا میرے سر آنکھوں پر۔انشاءاللہ بخیر وخوبی تجھے منزل مقصود کو پہنچادوں گا۔صوفی کچھ راہ خرچ لے کر اس کے ساتھ ہولیا۔جب آفتاب کا گردا مغرب کے تنور میں لگا اور شب نے اپنے چہرے پر تاریکی کی چادر تانی، وے دونوں ایک گاؤں میں جا کر کسی بنئے کی دکان میں اتر پڑے.....''۔(۱۳)

بیتال پچیسی: اس کتاب کا اصل ماخذ ہندی اور سنسکرت ہے۔سب سے پہلی سورت سر نے سنسکرت سے اس کا ترجمہ برج بھاشا میں کیا اور ۱۸۰۲ء میں مظہر علی خان ولا نے للولال جی کی مدد سے برج بھاشا سے اردو میں اس کا ترجمہ کیا۔یہ زمانہ محمد شاہ کے دور کا زمانہ تھا۔اس کتاب کی زبان سلیس اور رواں نہیں اس میں زیادہ تر ہندی الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے بعض جگہیں دور از فہم ہیں۔اس کتاب کے سارے مواد خالص ہندو دیومالا اور قدیم ہندو تہذیب سے لیے گئے ہیں۔اس کتاب میں پچیس کہانیاں شامل ہیں جو ایک بھوت (بیتال) راجا بکرماجیت کو سناتا ہے۔ہندو اساطیری اثرات اس کتاب میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔اس کتاب میں انشاء پردازی خالصتاً ہندی کی ہے۔اس کا نمونۂ عبارت درج ذیل ہے۔

> ''حسن ایسا گویا اندھیرے گھر کا اجالا، آنکھیں مرگ کی سی، چوٹی ناگن سی، بھویں کمان سی، ہونٹھ کندوری کی مانند، گلا کپوت کا سا، کمر چیتے کی سی، ہاتھ پاؤں کومل کمل سے چندر مکھی، چمپا برفی، ہنس گوئی، کوکل بینی جس کے روپ کو دیکھ اندر کی اپسرا بھی لجائے''۔(۱۴)

قصہ گل بکاؤلی: نہال چند لاہوری نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۳ء میں قصہ گل بکاؤلی کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کر کے

اس کا نام ''مذہب عشق'' رکھا۔اس قصے کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

الٰہی کر سخن کو میرے دہ گل　　کہ جس پر مرغ دل ہو سب کا بلبل

اس قصے کو سب سے پہلی عزت اللہ بنگالی نے فارسی میں لکھ دیا تھا۔اس قصے کا اردو میں منظوم ترجمہ ریحان الدین متخلص بہ ریحان لکھنوی نے ۱۲۱۱ ہجری میں کیا تھا۔اس میں تشبیہ اور استعارے بہت پائے جاتے ہیں لیکن ان کو چست اور برجستہ الفاظ میں ادا نہیں کیا گیا جس سے زبان میں رکاوٹ آ جاتی ہے. باقی زبان صاف ہے لیکن باغ و بہار یا آرائش محفل کی طرح رواں نہیں۔اس میں محاورہ اور روزمرہ کا استعمال کم ہے۔فارسی تراکیب بھی کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ زبان کے معاملے میں نہال چند کا مذاق قدیم منشیوں کا تھا اور انہوں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا۔اس لیے فورٹ ولیم کالج کے دوسرے قصوں کے برعکس زبان کے لحاظ سے مذہب عشق کی کوئی اہمیت نہیں۔(۱۵)

مذہب عشق کی زبان پر فارسی زبان کے اثرات کافی دکھائی دیتے ہیں۔فارسی تراکیب، استعارے اور تشبیہیں بڑی تعداد میں ملتی ہیں۔یہ کتاب پہلی بار ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی، اس کتاب کا ایک نمونہ عبارت درج ذیل ہے:

> ''خم خانہ سخن کا ساقی اس پرانی شراب کو نئے پیالہ میں یوں بھرتا ہے کہ جب بکاؤلی نے جادو بھری انکھیاں کھولیں اور خواب راحت سے چونکی۔انگیا چڑھائی۔کرتی درست کی۔پشواز ناز سے پہنی، کنگھی سنواری، اوڑھنی اوڑھی، آہستہ آہستہ جھکتی جھومتی اٹھکھیلیوں سے گل بکاؤلی کے حوض کی طرف چلی.....''۔(۱۶)

خرد افروز: فورٹ ولیم کالج کے تراجم میں خرد افروز کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔کلیلہ ودمنہ جس کا خرد افروز ایک روپ ہے۔ اس کی تالیف میں جانوروں کی زبانی آدابِ معاشرت تدبر منزل، آئین جہانبان و جہان داری کے اصول بتائے ہیں۔یہ کتاب دنیا بھر کی زبانوں میں ہر دور کے ادب پر اثر انداز ہوتی رہی ہے۔یہ کتاب شیخ ابوالفضل علامی کی کتاب ''عیار دانش'' کا اردو ترجمہ ہے۔اس قصے کا اصل ماخذ سنسکرت ہے۔سنسکرت سے برزویہ طبیب نے پہلوی میں اس کا ترجمہ ۵۳۹ء میں کیا اور یہ کتاب کلیلک ودمنگ کے نام سے مشہور ہوئی۔اور اسی پہلوی نسخے سے عبداللہ بن مقفع نے ۷۵۰ء میں اسے عربی زبان میں منتقل کیا۔دراصل یہ کتاب سب سے پہلی کتاب ہے جس کا پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔آگے چل کر ابوالمعالی نصراللہ نے ابن مقفع کے عربی ترجمے کو فارسی میں منتقل کیا(۱۷) اور ساتویں صدی ہجری میں احمد قانعی نے اسے فارسی نظم کی صورت میں منتقل کیا۔نویں صدی ہجری میں ملا حسین واعظ کاشفی سبزواری نے نصراللہ کے ترجمہ کے نسخے سے اپنی کتاب انوار سہیلی مرتب کی ۔یہ کتاب فارسی ترجموں میں سے بہترین کتاب ہے۔دسویں صدی ہجری میں اس داستان کو ابوالفضل نے اکبر بادشاہ کے حکم سے مقفع کے عربی ترجمے سے فارسی میں منتقل کیا اور عیار دانش نام رکھا۔اس کتاب میں اکثر جانوروں کی حکایات ہیں جن میں سے کئی عالم گیر شہرت کے مالک ہیں حفیفا الدین احمد نے عیار دانش سے پہلی بار ۱۸۰۳ء میں یہ قصہ اردو میں منتقل کیا اور خرد افروز نام رکھا۔

اس کتاب کی زبان سادہ ہے اور اس میں قواعد زبان کا خیال رکھا گیا ہے۔ مترجم نے فارسی محاوروں کا بھی ترجمہ کر دیا ہے اور جا بجا فارسی اسلوب بیان کی پیروی کی ہے۔(۱۸) اس کتاب کا ایک نمونہ عبارت درج ذیل ہے:

''نقل ہے کہ ایک باغبان تھا جو بے وقوفی کے مارے کسی ریچھ سے دوستی کر کے ہمیشہ، کیا باغ، کیا کھیت میں دونوں اکٹھے رہتے۔ ریچھ نے بھی محبت پا کر اس سے الفت پیدا کی تھی، یہاں تک کہ جب باغبان سو جاتا سرھانے بیٹھ کر منہ پر سے اس کے مکھیاں ہانکا کرتا۔ ایک دن باغبان سوتا تھا، بہت سی مکھیاں اس کے منہ پر جمع ہوئیں اور ریچھ بدستور آ کر مکھیاں ہانکنے لگا۔ ہر چند مکھیوں کو ادھر سے اڑاتا ادھر سے جمع ہوتی تھیں.....''(۱۹)

سنگھاسن بتیسی: اس قصے کو سنسکرت سے برج بھاشا کی زبان میں عہد شاہ جہانی میں ۱۶۳۱ء میں سندر داس کوی نے منتقل کیا پھر اس کے بعد للولال جی اور کاظم علی جوان نے مل کر ۱۸۰۴ء میں اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کا یہ ترجمہ ۱۸۰۵ء میں اردو اور ہندی میں شائع ہُوا۔ اس داستان میں عربی اور فارسی کے الفاظ بہت کم اور ہندی الفاظ بڑی تعداد میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں بھی بیتال پچیسی کی طرح ہندو مُعاشرت اور تہذیب کے اثرات بہت زیادہ نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب زبان اور بیان کے اعتبار سے نکھری سُتھری ہے اور اس میں تصنع بالکل نہیں۔ بعض مقامات پر زبان ایسی ہے جسے ہندوستانی کہا جا سکتا ہے، لیکن ان حصوں کے علاوہ ہندی بھاشا کے الفاظ کثرت سے موجود ہیں۔ یہ کتاب اردو کی نسبت ہندی رسم الخط میں زیادہ صحیح پڑھی جاتی ہے ہندی انشا پردازی کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اس کتاب کا بیان بہت موثر لگتا ہے۔ سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی سے کم رتبہ کتاب مانی جاتی ہے۔ اس کتاب کا ایک نمونہ عبارت درج ذیل ہے:

''کام کندلا ایک پاتر تھی۔ وہ گویا اور لیسی اوتار تھی۔ گندھرب بدیا میں اتی چتر تھی۔ وہ راجا کی سبھا میں نرت کر رہی تھی۔ مادھو بھی اوسی رجہ کے دوار پر جا پہنچا۔ دوار پالوں سے کہا کہ راجا کو جا کر ہمارا سماچار کہو کہ آپ کے درشن کو ایک برہمن آیا ہے۔ ڈیوڑھی دار اوس کی بات سنی ان سنی کر گئے.....''۔(۲۰)

تصنیفات بیرون فورٹ ولیم کالج

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے عہد میں اس کالج سے باہر جو داستانیں ملتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

ہشت بہشت: امیر خسرو دہلوی (متوفی ۱۳۲۵ء) نے ''ہشت بہشت'' کے نام سے یہ فارسی مثنوی ۷۰۱ ہجری میں تصنیف کی تھی اور اس کا ترجمہ شاہ حسین حقیقت نے فارسی نثر میں ''ہشت گل گشت'' کے نام سے کیا تھا۔ شاہ حسین حقیقت کی اس تصنیف کے لکھنے کی تاریخ نا معلوم ہے۔ شاہ حسین حقیقت کی منثور فارسی داستان ''ہشت گل کشت'' کا غلام احمد دہلوی نے ۱۸۰۱ء میں اردو نثر میں ترجمہ کیا۔(۲۱)

اس داستان کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں بھی موجود ہے۔ کلکتہ میں رہنے کے بعد ان کا تعارف ہنری مارٹن سے ہوا اور ان کے کہنے پر اُنہوں نے ''ہشت گل کشت'' کا ترجمہ کیا۔ اس داستان کے مصنف نے اپنی داستان کی تاریخ

ترجمہ یوں کہی ہے:

چھوڑ کچھ اس جہاں میں ایسی یاد
خلق جس سے کرے بہ نیکی یاد
یہ صنم خانہ جب ہوا طیار
ہوئی تاریخ اس کی باغ و بہار

نوطرزِ مرصع: دوسری نوطرزِ مرصع، غوث زرین کی ہے۔ اُنہوں نے یہ قصہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا ہے۔ یہ کتاب بہت مختصر ہے۔ زرین نے اس چھوٹے سے قصے میں تحسین اور امن سے کئی جگہ اختلاف کیا ہے۔ زرین نے اپنا قصہ فارسی سے لیا ہے، لیکن میر امن نے تحسین کی نوطرزِ مرصع سے اکتسابِ فیض کیا۔ زرین نے اپنی کتاب مرتب کرنے کی تاریخ بھی میر امن کی ''باغ و بہار'' ۱۲۱۷ ہجری تحریر کی ہے، لیکن اُنہوں نے اس کتاب میں تحسین کی کتاب کا ذکر تک بھی نہیں کیا۔ زرین کی اس کتاب میں مسجع فقروں کی تشویش اور قافیہ پیمائی نے بڑی حد تک قصہ کی لطافتوں اور دل چسپیوں کو پامال کر دیا ہے۔ اس کا فارسی قصہ بہت طویل ہے، لیکن نوطرزِ مرصع زرین مختصر ہے۔ دراصل زرین نے اپنے فارسی نسخہ سے ہی اردو کا نسخہ مرتب کیا ہے اور کچھ باتیں اُنہوں نے حذف کر دی ہیں، لیکن جیسے واقعات نوطرز مرصع میں ملتے ہیں وہی حرف بہ حرف ان کے اس فارسی نسخے میں ملتے ہیں۔ زرین نے اپنے اردو نسخے میں تحسین کی نوطرزِ مرصع سے کوئی استفادہ نہیں کیا۔ اس کے دیباچے میں زرین نے اس کتاب کی تاریخِ تصنیف بھی تحریر کی ہے:

بنا کر یہ گل دستۂ روزگار لکھی اس کی تاریخ ''باغ و بہار'' (۱۲۱۷ ہجری)

اس کتاب کا ایک نمونہ عبارت فارسی اور اردو میں درج ذیل ہے:

فارسی عبارت: ''اوّل در ساعت سعید پری نوش دختر ملک الملوک را چون در شاہوار بعقد شہزادہ بختیار در آوردند و کوس شادی و مبارک بادی زدند بعد از آن دختر شاہ شام برسم اہل سلام بزنی خواجہ زادہ یمنی در آمد و دختر پادشاہ فرنگ ہمدم پادشاہ عجم گشت.....''۔ (۲۲)

اردو ترجمہ: ''اور پری خوش اپنی بیٹی شہزادہ بختیار کو دی اور دختر شاہ شام خواجہ زادہ یمنی کے عقد نکاحمیں آئی اور دختر شاہ فرنگ شہزادہ عجمی نے پائی.....''۔ (۲۳)

رانی کتیکی کی کہانی: اردو کا یہ مختصر ترین طبع زاد افسانہ انشاءاللہ خان انشا کی تخلیق ہے جسے انہوں نے ۱۸۰۳ء میں لکھا ہے۔ اس قصے کو ''داستان رانی کتیکی اور کنور اودھے بھان'' کے نام سے ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔

انشاءاللہ خان انشا بہت بڑے زباندان، عالم، شاعر اور مسلم الثبوت استاد تھے، انشا جس زمانے میں رہتے تھے اس میں نثر نگاری کا ماحول نہیں تھا لیکن پھر بھی انہوں نے یہ افسانہ لکھ کر اردو نظم کے ساتھ ساتھ اردو نثر پر بھی احسان کیا۔ رانی کتیکی کا افسانہ سیدھا سادہ ہے اور اس دور کی قصہ گوئی کے عام انداز کے مطابق طولانی نہیں۔ اس افسانہ کی اہمیت اس کی زبان میں

ہے۔مصنف نے دراصل ہندی پن میں سلاست اور حلاوت گھولنے کی کوشش کی ہے۔تکلف ،رنگینی ،مرصع کاری اور مقفی عبارتیں اس زمانے کی نثر کی عام خصوصیات تھیں۔لیکن انشا نے اپنے افسانے میں ان چیزوں سے حذر کیا۔چونکہ خود مصنف آزاد منش تھا اس افسانے میں بھی آزادی اور بے تکلفی دکھائی دیتی ہے۔اس افسانے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں ہیر پھیر نہیں صاف اور کھری کھری باتیں ہیں خصوصاً انہوں نے رعایت لفظی سے گریز کی کوشش کی ہے البتہ بعض جگہ انشا نے پر تکلف الفاظ سے بھی کام لیا ہے۔انشا نے اپنے انداز بیان سے اسے اور زیادہ پر لطف اور دل فریب بنا دیا ہے۔افسانے میں طرح طرح کے حالات جزئیات کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں ،محبت کی باتیں ،اشارے کنائے ، دوستی دشمنی، وصل وفراق ، تعویز گنڈے،شادی کا سماں لڑائی کی تفصیل ،بازار کی آرائش وسجاوٹ و.....غرض سب کچھ ہے۔افسانے کا پلاٹ بالکل فطری لگتا ہے۔افسانے میں رانی کتکی کا کردار سب سے نمایاں کردار ہے۔اس کتاب کا ایک نمونہ عبارت درج ذیل ہے:

''یہ بات سن کر جو لال جوڑے والی سب کی سردھری تھی اون نے کہا۔ہاں جی بولیاں ٹھولیاں نہ مارو۔ان کو کہہ دو جہاں جی چاہے اپنے پڑ رہیں اور جو کھانے پینے کو مانگیں انہیں پہنچا دو۔گھر آنے کو کسی نے آج تک مار نہیں ڈالا۔منہ کا ڈول گال تمتمائے اور ہونٹھ پپڑائے اور گھوڑے کا ہانپنا اور جی کا کاہنا اور گھبراہٹ اور تھرتھراہٹ اور ٹھنڈی سانسیں بھرنا اور نڈھال ہو کر گرے پڑنا ان کو سچا کرتا ہے.....''۔(۲۴)

سلک گوہر: یہ کتاب بھی انشاء اللہ خان انشا کی تخلیق ہے۔اس داستان کے لکھنے والے نے غیر منقوط نثر میں کہانی لکھنے کا ایک تجربہ اس داستان کی صورت میں کیا۔اگر چہ انشا کے دور میں بے نقط لکھنا اور شعر کہنا علمی استعداد اور زبان دانی کے اظہار کا ذریعہ شمار ہوتا تھا۔انشا کی غیر منقوط شاعری ان کی کلیات میں شامل ہے۔اس داستان کی ضخامت چالیس صفحات پر مشتمل ہے لیکن اسی اختصار کے باوجود انشا نے اس میں اپنی قادر الکلامی اور طباعی کے جوہر دکھائے ہیں۔اس میں مصنف نے داستانی حکایات وروایات کا احترام کیا ہے اور دوسرے قصہ گوؤں کی طرح انشا نے بھی سلک گوہر کا آغاز حمد ونعت سے کیا ہے۔اس داستان میں جادوئی بیان کا التزام بھی ہے طلسم اور جادوئی اشیا کے بارے میں باتیں موجود ہیں۔انشا کی اس داستان میں قافیہ آفرینی کی تراش بھی پائی جاتی ہے۔اس مختصر سی داستان میں انشا نے فارسی ،عربی ،ترکی ، پنجابی ، بنگالی زبانوں کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔انشا نے پوری کہانی میں اپنی شوخ طبعی اور ظرافت کو قائم رکھا ہے اگر چہ زبان وانداز بیان دونوں کے اعتبار سے انشا کی یہ کوشش ادبی عجائب کی زینت بنی جو کہ ستائش کے قابل بھی ہے،لیکن اس کا اصل مدعا غائب ہو گیا ہے۔یہ داستان حقیقتاً غیر منقوط الفاظ کا ایک کھیل نظر آتا ہے جس میں مختلف زبانوں کے الفاظ کھلاڑیوں کی طرح اس میں گھر کر رہ گئے ہیں۔یہ داستان اب تک گمنام ہے البتہ اس داستان کا ذکر ساحل بلگرامی نے تذکرۂ چمن اردو میں کیا ہے اور اس کو حال ''ملکہ زنوبیہ'' کا حال کہا ہے لیکن اس بات کی اُنہوں نے توجیہ نہیں کی۔(۲۵)اس کتاب کا ایک نمونہ عبارت درج ذیل ہے:

''ملکہ گوہر آرا کا دل اس حال کا مطلع ہوا،اس دم محرم اسرار،مہر کردار،ہم عصر،ماہ رو کو کہا کہ ادھر آؤ،

اوراس کو لاؤ، ہر گاہ مارمہرۂ عطارد الماس آسا کالا گا، اور محل لسع مارمدسما کالا ہوا، اور مداد مرمک حور ملاء اعلی کا مسودہ کھلا، اور وسواس کا کلسر ااس کا اگلا ہواسم کھا کر سو رہا......‘‘۔(۲۶)

حوالہ جات

۱۔حیدر بخش حیدری، طوطا کہانی، لاہور، ۱۸۰۱ء، ص ۳۷

۲۔خلیل علی خان اشک، داستان امیر حمزہ، لاہور، ۱۸۰۱ء، ص ۲

۳ کاظم علی جوان وللو لال جی، شکنتلا، نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۷۵ء، ص ۳۱

۴۔آرزو چودھری، داستان کی داستان، عظیم اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۳

۵۔حیدر بخش حیدری، آرائش محفل، نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۲۰، ص ۱۱۸

۶۔مظہر علی خان ولا وللو لال جی، مادھونل کام کندلا، قلمی نسخہ، برٹش میوزیم، ۱۸۰۱ء، ص ۴۱

۷۔میر امن دہلوی، باغ و بہار، ص ۳

۸۔سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو داستان، تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص ۱۱۸

۹۔ایضاً ص ۱۲۰ ۱۰۔میر امن دہلوی، باغ و بہار، مطبوعہ کلکتہ، ص ۳

۱۱۔سہیل بخاری، ڈاکٹر، ایضاً ص ۱۳۳ ۱۲۔بہادر علی حسینی، نثر بے نظیر، مطبوعہ فورٹ ولیم کالج پریس

۱۳۔مظہر علی ولا، بیتال پچیسی، مفید عام پریس لاہور، ۱۸۰۳، ص ۱۳

۱۴۔گیان چند جین، ڈاکٹر، اردو کی نثری داستانیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ص ۱۹۵۴ء، ص ۱۸۵

۱۵۔نہال چند لاہوری، مذہب عشق، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلس ترقی ادب لاہور، س ن، ص ۷۷

۱۶۔سہیل بخاری، ڈاکٹر، ایضاً ص ۱۲۲ ۱۷۔ایضاً

۱۸۔کاظم علی جوان وللو لال جی، سنگھاسن بتیسی، دہلی، ۱۸۰۴ء، ص ۵۶

۱۹۔سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو داستان، ایضاً ص ۱۴۷

۲۰۔محمد غوث زریں، نوطرز مرصع، نولکشور پریس، کانپور، ۱۸۸۱ء، ص ۱۳۵

۲۱۔ایضاً ص ۴۸ ۲۲۔رسالہ اردو، انجمن ترقی اردو ہند، ۳۱۔۱۹۳۰ء، ص ۲۷۱

۲۳۔سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو داستان، ایضاً ص ۱۱۷

۲۴۔انشا اللہ خان انشا، سلک گوہر، مطبوعہ اسٹیٹ پریس رام پور، ۱۹۴۸ء، ص ۶

۲۵۔گیان چند جین، ڈاکٹر، اردو کی نثری داستانیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۴ء

۲۶۔سہیل بخاری، ڈاکٹر، ایضاً